ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.3 (2023)
(July - September)

# رومانیت کا مبہم تصور

ڈاکٹر محمد عطااللہ
اسلم حمید
حافظ غلام مرتضی

Abstract
As a term romanticism has always attracted critics to analyze poetry and poets on certain scale. This term has brought many other terms with it like classicism, revolution, utility and many other concepts which are associated with comments either in favor of romantic poet or against him. In this article the focal point of discussion is the basic concept of romanticism that is always present in poetry and prose even when it is considered against the trend of romanticism. From Hali to Iqbal, romanticism has always been a part of poetry.

رومانیت، کلاسیکیت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی تنقیدی اصطلاحات عموماً ادب کے طلبہ کے لیے الجھن کا باعث بنتی ہیں- خصوصاً اس وقت جب نقاد ان اصطلاحات کو ایک تحریک یا ایک مخصوص عہد کے رجحان کے طور پر پیش کرتے ہیں- یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ ان اصطلاحات اور ان کے علاوہ رائج اصطلاحات سے وابستہ مخصوص رجحانات کا تعلق مخصوص زمان و مکان سے رہا ہے لیکن ایسا نہیں کہ کوئی بھی رجحان کسی زمانے میں سرے سے ختم ہو گیا ہو یا کبھی وجود ہی نہ رکھتا ہو- یہ کچھ مبہم سے تصورات ہیں جو نقادوں کے لیے تختہ مشق نہ بنتے تو شاید ان کی طرف توجہ ہی نہ کی جاتی- اردو ادب مین جس چیز کو رومانیت کہا جاتا ہے وہ بھی کچھ اسی قسم کا تصور ہے-

مولانا حالی جو اب پرانے اور نئے دور کے درمیان ایک حدِ فاصل کے طور پر پہچانے جاتے ہیں خود ایک شدید قسم کے رومانی شاعر تھے- انھوں نے مقدمہ شعر و شاعری میں قدیم شاعری پر شدید اعتراضات کیے تھے اور قدماء اور متأخرین کی شاعری کے فرق کو بہت سی مثالوں سے واضح کرتے ہوئے شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ عصر حاضر کے شعراء کے لیے فرسودہ اور پیش پا اُفتادہ مضامین ترک کر کے ایسے مضامین پیش کرنا انتہائی ضروری ہے جو عصری تقاضوں سے مطابقت رکھتے ہوں- کیا مولانا حالی اصلاح کے جوش میں فرد کے جمالیاتی ذوق کو نظرانداز کر گئے؟کیا خود ان کی شاعری میں رومانیت باقی نہ رہی؟ یا اگر میں اس سوال کو زیادہ گہرائی میں دیکھنا چاہوں تو کیا مقصدیت اپنی نہاد میں رومانیت ہی کی ایک صورت نہیں؟اس کا ایک مظاہرہ ہمیں انجمنِ پنجاب کے مشاعروں میں دکھائی دیتا ہے- انجمنِ پنجاب کے یہ مشاعرے اس اعتبار سے اہم ہیں کہ ان مشاعروں میں فطری حسن کو شاعری کا حصہ بنانے کی کوشش کی گئی-ڈاکٹر انور سدید نے اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا تھا-

”آزاد کی تحریک نے انسان کو لازوال فطرت کی آواز پر کان دھرنے، خیر کی قدر کو داخل سے اور حسن کی قدر کو خارج سے اُجاگر کرنے پر مائل کیا اور یوں آزاد نے اُس صداقت کو اُبھارا جو جمالِ فطرت بن کر انسان کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھی-“[1]

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو انجمنِ پنجاب کے مشاعروں میں رومانیت کے ابتدائی نقوش خبروں کے طور پر نظر آتے ہیں- لیکن اس تحریک کا بنیادی کام جدید نظم کا فروغ ہی ہے اور یہ تحریک اپنی نہاد میں کلاسیکیت کی طرف مائل ہے کہ اس میں شاعر کو ایک متعین سمت دینے کی کوشش کی گئی- رومانوی شاعری کا بھرپور آغاز شیخ عبدالقادر کے رسالہ ”مخزن“ سے ہوتا ہے-ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں

اسسٹنٹ پروفیسر، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور
پی ایچ ڈی اسکالر،جی سی یو ،لاہور
لیکچرار، لاہور لیڈز یونیورسٹی ،لاہور

"مخزن" کے ادیبوں نے پہلی مرتبہ اُردو ادب کے لہجے میں ملائمت پیدا کی اور زندگی کی ان لطافتوں اور شیرینیوں کا احساس دلایا جو کائنات میں چار سُو پھیلی ہوئی ہیں۔"[2]

اگرچہ اردو ادب میں ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا لیکن ایک باقاعدہ تحریک کے طور پر دیکھیں تو علی گڑھ تحریک کی خشک مقصدیت پسندی کے بعد مخزن کے ادیبوں کی کاوشیں غنیمت محسوس ہوتی ہیں۔

'مخزن' کے اس اندازِ نظر کا سب سے بھرپور اظہار اقبال کی شاعری کی صورت میں سامنے آیا۔ 'مخزن' کے صفحات تک پہنچنے سے پہلے اقبال لاہور کے مشاعروں میں مشہور ہو چکے تھے لیکن 'مخزن' سے اُن کا نام ایک عظیم شاعر کے طور پر سامنے آیا۔ اقبال اپنے ابتدائی دور میں ہی حسنِ فطرت کو نظم کا حصہ بنا رہے تھے لیکن مغربی شاعری خصوصاً ورڈزورتھ کے مطالعہ نے انھیں رومانوی شاعری کے اور بھی قریب کر دیا۔ بلکہ بقول اقبال کے ورڈزورتھ نے انھیں الحاد سے بچا لیا۔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں اقبال فطرت کی رنگینیوں میں گم ایک ایسے شاعر کے طور پر سامنے آئے جو پہاڑوں کے دامن میں بہتے جھرنوں کے گیت سنتا، پھولوں اور ستاروں سے ہم کلام ہوتا اور پرندوں کے نغمے سنتا چلا جاتا ہے۔ وہ حسنِ ازل کی جستجو میں مگن ایک حیران تماشائی کی طرح اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی دُنیا کا مشاہدہ کرتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت ایک نئے انداز سے عبارت نظر آتی ہے کہ اقبال صرف حسنِ فطرت کا شاہد اور ناظر ہی نہیں نظر آتا بلکہ فطرت کے اِس جمال میں معنی کا ایک نیا جہان دریافت کرنے کی جستجو بھی کرتا ہے۔

سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے
راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے
میری صورت تو بھی اِک برگِ ریاض طُور ہے
مَیں چمن سے دُور ہوں تُو بھی چمن سے دُور ہے
مطمئن ہے تو پریشاں مثل بو رہتا ہوں مَیں
زخمیٔ شمشیر ذوقِ جستجو رہتا ہوں مَیں
(گلِ رنگیں)

"بانگِ درا" کی اِس ابتدائی نظم میں اقبال حسنِ فطرت کی طرف ایک حیرت کے عالم میں دیکھتے ہیں۔ لیکن اپنی ذات اور اپنے ہونے کا احساس انھیں مجبور کرتا ہے کہ وہ فطرت کے آئینے میں حیاتِ انسانی کا جواز تلاش کریں۔ اِسی تلاش میں اقبال اپنے عظیم ماضی کی وسعتوں میں جھانکتے ہیں۔ یہ اقبال کی رومانیت کا ایک اور زاویہ ہے۔

آگ بجھی ہوئی اُدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اِدھر
کیا خبر اِس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں
(ذوق و شوق)

اور بالآخر اپنے ہونے کا جواز تلاش کرتے ہوئے اقبال اُس منزل پر پہنچتے ہیں جہاں انھیں حیاتِ انسانی کا اوّلین مقصد اپنے خالق کی رضا اور خوشنودی نظر آتا ہے۔ اور اِس رضا کے حصول کے لیے عشق وہ بنیادی قوت بن کر سامنے آتا ہے جو زمان و مکاں سے ماورا ہے اور جس کے بغیر انسان خودی اور خود شناسی کی منزلوں سے دُور ہو جاتا ہے۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

اگر ہم رومانی شعراء کے بنیادی رجحانات کو سامنے رکھیں اور کلاسیکیت کے مقابلے میں رومانیت کو ایک ردِّعمل کے طور پر دیکھیں تو اقبال کا فلسفہ بھی ایک رومانی شاعر کے انقلاب پسند ذہن سے پھوٹتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ وہ فلسفی ہے جو اپنے گرد و پیش سے مطمئن نہیں اور اپنے فلسفے سے ایک خیالی دُنیا آباد کرتا نظر آتا ہے۔ وہ معاشرے کے جامد کرداروں میں تحرک دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لیے اقبال

کی رومانیت کا ایک اہم پہلو اُن کے کردار ہیں- ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں اقبال کے اِس رومانی پہلو کا عملی زاویہ:

"مثبت سطح پر مردِ مومن اور منفی سطح پر ابلیس کے کرداروں میں موجود ہے۔"[3]

لیکن ابلیس کا منفی کردار بھی اقبال کے نزدیک اس کائنات کے نظام کے لیے ضروری ہے-

جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا
(جبریل و ابلیس)

اِن تمام پہلوؤں کے مدِّنظر اقبال کا فلسفہ بھی بنیادی طور پر ایک رومانی رجحان کے طور پر ہی سامنے آتا ہے- اُن کے ہاں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو کسی بھی رومانی شاعر کو ممتاز کرتے ہیں-رومانی تحریک کے اثرات سے نمو پانے والے دوسرے اہم شاعر جوش ملیح آبادی ہیں- گو وہ شاعر انقلاب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بقول:

"وہ شاعر انقلاب بھی ہیں اور شاعرِ شباب بھی"[4]

جوش کے بارے میں یہ رائے بہت جامع ہے- غور کیا جائے تو جوش کے ہاں انقلاب کا نقطۂ نظر بھی رومانوی انتہاپسندی کا نتیجہ ہے- انھوں نے انقلاب کا جو خواب دیکھا اُس کے پس منظر میں 'حسن' کی مظلومیت کا گہرا دُکھ نظر آتا ہے- جوش کا مسئلہ یہ ہے کہ اُن کے ہاں جذبے کی گہرائی نظر نہیں آتی بلکہ لفظی گھن گرج اور نعرہ لگانے کا انداز زیادہ نمایاں ہے- اُن کے ہاں حسن کا تصور نسوانی حسن کے خدوخال بیان کرنے کی طرف مائل نظر آتا ہے- ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے بقول جوش اُن شعرا میں سے تھے جو

"دراصل انہی امنگوں اور آرزوؤں کے ترجمان تھے جن کو ادب کے نثری خالص مادی اور عقلی رجحانات نے عرصے سے دبا رکھا تھا۔"[5]

اس بات میں یقینا کوئی شبہ نہیں کہ علی گڑھ تحریک کے خالص عقلی اور مادی رجحانات نے شاعری کے جمالیاتی پہلو کو طویل عرصہ دبائے رکھا اور اس کا ردِّعمل رومانوی شاعری کی صورت میں سامنے آیا لیکن جوش کے ہاں یہ ردِّعمل حسنِ فطرت کے بیان سے آگے بڑھ کر جنسیت کے بیان تک پہنچتا نظر آتا ہے- حتیٰ کہ انھیں بھکارنوں، مالنوں اور مہترانیوں کا حسن بھی متأثر کرتا دکھائی دیتا ہے اور وہ انقلاب کا نعرہ لگاتے اور ہندوستان کی قسمت پر ماتم کرتے ہوئے درحقیقت اپنی اُسی ذہنیت کا اظہار کرتے ہیں

ہائے یہ بھچتی ہوئی نوعمر جامن والیاں
عاقبت اندیش دہقانوں کی سمجھائی ہوئی
ہائے یہ کافر مناظر ہوش میں رکھتے نہیں
جوش ان فصلوں میں اکثر اپنی رسوائی ہوئی

جوش کے ہاں کہیں کہیں رومانیت کے وہ زاویے بھی نظر آتے ہیں جو حقیقتاً حسنِ فطرت کے تاثر اور بیان کا حسین مرقع ہیں-

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

رومانی شعراء میں خالص رومانیت کی ایک بہت بڑی مثال حفیظ جالندھری ہیں- زندگی بھر بہتر روزگار کی جدوجہد میں مصروف رہنے والے اِس شاعر نے اُردو نظم اور گیت کو جس غنائیت اور موسیقی سے روشناس کرایا، اُس کی مثال کہیں نہیں ملتی- حفیظ جالندھری رومانویت کے ہر معیار پر پورے اُترتے ہیں- فطرت کی سادگی اور دلکشی اُن کی نظموں میں ایک جادوئی فضا کی طرح محیط نظر آتی ہے- خصوصاً اُن کی نظمیں "پرانا بسنت"، "راوی میں کشتی"، "چناب"، "توبہ نامہ" اور "شامِ رنگیں" وغیرہ مناظر فطرت اور غنائیت کا حسین امتزاج پیش کرتی ہیں :

شہ درے کے نوحہ خواں مینار بھی خاموش ہیں
مقبرہ بھی باغ بھی اشجار بھی خاموش ہیں
اُس طرف سائے کو لپٹائے ہے پل سویا ہؤا
چاندنی پر ریت کا ہے جزو و کل سویا ہؤا
اِس طرف اُجڑی ہوئی بارہ دری خاموش ہے
اِک گئے گزرے پرانے خواب میں مدہوش ہے
اوڑھ کر مغموم بیوہ کی طرح چادر سفید
کروٹیں لیتی ہے راوی ناشکیب و نااُمید
(راوی میں کشتی)

حفیظ فطرت کا بیان ضرور کرتے ہیں لیکن فطرت کے اُن گہرے احساسات تک نہیں پہنچتے جو روحِ انسانی پر وہ نقش مرتب کرتے ہیں جو انسان کے جذبات کو ترفّع دیں- حفیظ کے ہاں پہاڑوں، ندیوں اور پھولوں کا دلکش بیان ہے لیکن فطرت کی وہ عظمتیں ناپید ہیں جو اقبال کی لازوال شاعری کا حصہ ہیں- ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں:

"He has a feeling for the ordinary aspects of nature - the calm and beauty of the countryside, streams, rivers, trees, verdure - but he has no feeling for the sublime effects of nature."[6]

فطرت کے معمولی پہلوؤں کے لیے بھی ان میں ایک احساس ہے-دیہات کی خاموشی اور سکون، ندیاں، دریا اور درخت، لیکن فطرت کے ترفع بخش اثرات کے لیے وہ کچھ محسوس نہیں کرتے-

اس بات کو ڈاکٹر انور سدید نے مثبت نقطۂ نظر سے دیکھا ہے- لکھتے ہیں:

"بلاشبہ حفیظ کا سماجی عہد بیداری اور عقلیت کا عہد ہے لیکن اُن کی رومانیت کی بدولت انھیں فطرت کے سحرِ خواب ناک نے گہرے فلسفے میں الجھنے کی بجائے تخیل کے جزیروں میں اُڑنے پر مائل کیا ہے-"[7]

حفیظ تخیل کے انہی جزیروں میں اُڑتے ہوئے زندگی کے سحر و شام سے محو ہمکلام ہوتے ہیں- اُن کی دُنیا حسینہٴ سحر کی زر اندوز تاج پوشی سے شروع ہوتی ہے اور شام کی ساحرہ کے بکھرے ہوئے کالے بادلوں میں گم ہو جاتی ہے- پہاڑ کبھی خندۂ نگاہ سے طور بن جاتے ہیں اور کبھی ظلمات کی پریوں کے تاریک دامن میں چھپ جاتے ہیں- حفیظ کی رومانیت کے پس منظر میں اُداسی اور غم کی ایک ہلکی سی لہر مستقل موجود رہتی ہے اور یہی ایک خالص رومانی شاعر کا خاصہ ہے- اِس اعتبار سے حفیظ رومانوی شاعری میں بہت اہمیت کے حامل ہیں-

رومانویت کی خالص اور بے باکانہ صورت کا نمایاں ترین اظہار اختر شیرانی کے ہاں ہوتا ہے- اُن کی شاعری میں نسوانی حسن کے حوالے سے ایک والہانہ شیفتگی نظر آتی ہے- رومانیت کے عملی پہلو کے برعکس اختر کی شاعری میں گریز اور ہجرت کی ایک تمنا نظر آتی ہے- وہ امن و سکون کی تلاش میں کسی انقلاب کے خواہاں محسوس نہیں ہوتے بلکہ اِس جدوجہد اور عمل کی دُنیا سے دور عالمِ حُسن میں ایک نئی دُنیا بسانے کی آرزو رکھتے ہیں- ایک ایسی دُنیا جہاں پھولوں اور ستاروں کی محفل میں حسن و رعنائی اور شراب و شباب کے قصے ہوں- جہاں زندگی کا مقصد صرف اور صرف سکون اور محبت ہو-

اے عشق کہیں لے چل، اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے، لعنت گہِ ہستی سے
اِن نفس پرستوں سے، اس نفس پرستی سے
دور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل
آنکھوں تلے پھرتی ہے اِک خواب نما دُنیا

تاروں کی طرح روشن مہتاب نما دُنیا جنت کی طرح رنگیں، شاداب نما دُنیا
لِللہ وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اختر شیرانی کے اِس یوٹوپیا میں ہمیں رنگین وادیاں نظروں کے سامنے رقصاں نظر آتی ہیں اور کبھی افق پر موجزن آوارہ خوابوں کی گھٹائیں دکھائی دیتی ہیں- یہ دُنیا ستاروں کے سمندروں اور ماہتابوں کے جزیروں کی دُنیا ہے- اور اِس دُنیا کا حسن سلمیٰ، ریحانہ، مرجانہ اور عذرا کے عشق کے افسانوں سے عبارت ہے- اختر شیرانی کی شاعری کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے حسنِ کائنات کو نسوانی حسن میں تلاش کیا ہے- چنانچہ اُن کی شاعری میں نسوانی کردار ایک ایسے پیکر کے روپ میں اُبھرتے ہیں جو سکون اور آرام کی علامت ہے- وہ بنیادی طور حسیّات کے شاعر ہیں- چنانچہ اُن کے ہاں تمثال نگاری کے قابلِ قدر نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں-

مری آغوش میں ہوگا وہ جسمِ مرمریں اُس کا
وہ اُس کے سرمئی کا کُل وہ روئے نازنیں اُس کا
وہ رخسار حسیں اس کے وہ حسنِ یاسمیں اس کا
وہ جس سے شوق کی دُنیا کو مہکائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

ایک خالص رومانی شاعر کی طرح اختر کے ہاں بھی تخیل اور جذبے کی شدت نظر آتی ہے- لیکن اختر کا تخیل حسن کے حسیاتی اظہار کی طرف زیادہ مرکوز نظر آتا ہے-

غائب از چشم تھی جنت کی بہاروں کی طرح
دستِ انساں سے تھی محفوظ ستاروں کی طرح
صبح کی طرح سے دوشیزہ تھی ہستی تیری
بوئے گل کی طرح پاکیزہ تھی ہستی تیری
تیرے اشعار بہشتوں کی بہاروں کے ہجوم
تیرے افکار تھے یا چاند ستاروں کے ہجوم

اختر شیرانی کی شاعری کا ایک اہم پہلو اُن کی وطن پرستی ہے- لیکن یہاں بھی وہ وطن کو ایک دلنواز اور دلفریب محبوبہ کے روپ میں ہی دیکھتے ہیں- اُنھوں نے اکثر اوقات شاعری میں بڑی خوبصورت نغمگی پیدا کی ہے- مجموعی طور پر اختر شیرانی رومانوی شاعری کا خالص اور بھرپور انداز رکھتے ہیں-

رومانوی شاعری کے ضمن میں ایک اہم نام عظمت اللہ خان کا ہے- عظمت اللہ خان کی خوبی یہ ہے کہ اُنھوں نے اُردو اور ہندی کے امتزاج سے لوک گیتوں کی تجدید کی- ان کی انفرادیت اُن کی منظر نگاری میں ہے- اُن کی شاعری پر ہندوستانیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے- اُن کی نظمیں "پیپل" اور "برکھا رُت کا پہلا مہینہ" اس سلسلے میں مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں- اُن کے ہاں بھاشا کو اُردو کے
ساتھ ملانے کا عملی اظہار بھی ملتا ہے۔ ہندی آمیز اسلوب اور مترنم بحریں اُن کی شاعری کا نمایاں پہلو ہے۔ "مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا" اور "وہ پھول ہوں جس کا پھل نہیں ہے" قسم کی لفظوں میں یہ اسلوب بہت نمایاں ہے۔ اکثر رومانی شعراء کی طرح عظمت اللہ خان کے ہاں بھی عشق کا جذباتی انداز موجود ہے۔

تمہیں یاد ہیں وہ دن بھی کہ لگی تھی آگ من میں
وہ دوانہ پن کا سن بھی کہ بھری تھی برق تن میں
مرا دن بھی رات تم تھیں مری کائنات تم تھیں

عظمت اللہ کی شاعری نظم کے ابتدائی تجربے کے طور پر اہم ہے-

اِن تمام رومانی شعراء کے اثرات اُردو ادب پر بہت گہرے تھے- چنانچہ ہمیں رومانوی تحریک کے اختتام اور ترقی پسند تحریک کے آغاز پر بہت سے ایسے شعراء نظر آتے ہیں، جنہوں نے اقبال، حفیظ، اختر شیرانی اور جوش وغیرہ سے متأثر ہو کر رومانی انداز شعر اپنایا- اِن میں علی اختر حیدر آبادی، اختر انصاری دہلوی، حامد اللہ افسر، روش صدیقی، ساغر نظامی، احسان دانش اور الطاف مشہدی کے نام اہم ہیں-

علی اختر خواب ناک فضاؤں کے شاعر ہیں- اختر انصاری کے ہاں غم کا گہرا احساس ملتا ہے اور حامد اللہ افسر زندگی کے خوبصورت اور ہنستے مسکراتے پہلو بیان کرتے ہیں- احسان دانش کو اِس اعتبار سے خصوصیت اہمیت حاصل ہے کہ اُن کی رومانیت میں غربت کا گہرا داخلی احساس نظر آتا ہے-

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو رومانوی تحریک کے اثرات کے تحت ہمیں اُردو شاعری میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے- شاعری کا وہ جمالیاتی پہلو جو ادب کے قاری کے ذوق کی تسکین کا باعث بنتا ہے اور ادب کو مقصود بالذات کے درجے پر فائز کرتا ہے، رومانوی شعرا کے ہاں نظر آتا ہے- خصوصاً اقبال کے ہاں فطرت کے حوالے سے جذباتِ انسانی کا جو ترفّع شاعری کا حصہ بنا وہ عدیم المثال ہے- حفیظ کا ترنّم اور نغمگی بلاشبہ اُردو شاعری کو ایک نئے اسلوب سے آشنا کرتی ہے- اسی طرح جوش کا مردانہ نعرۂ انقلاب اور اختر شیرانی کی کائناتِ حسن اُردو شاعری کے لیے اثاثہ ہیں- یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ رومانی تحریک نے اُردو شاعری کو نہ صرف خوبصورت خیالات سے روشناس کر دیا بلکہ اظہار کا سلیقہ بھی دیا-

حوالہ جات

[1] ڈاکٹر انور سدید، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمنِ ترقی اُردو پاکستان، ۹۹۹۱ء، ۹۶۳-
[2] ڈاکٹر سیّد عبداللہ، مباحث، علمی کتب خانہ لاہور، ۹۷۹۱ء، ص ۹۲۲-
[3] انور سدید، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمنِ ترقی اُردو پاکستان، ۹۹۹۱ء، ۸۲۴-
[4] بحوالہ ڈاکٹر انور سدید، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمنِ ترقی اُردو پاکستان، ۹۹۹۱ء، ص ۷۴۴-
[5] ڈاکٹر سیّد عبداللہ، مباحث، علمی کتب خانہ لاہور، ۹۷۹۱ء، ص ۳۳۲-
[6] ڈاکٹر محمد صادق، A History of Urdu Literature، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن، ۴۶۹۱ء، ص ۱۹۳-
[7] ڈاکٹر انور سدید، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو، پاکستان، ۹۹۹۱ء، ص ۶۴۴-